جس روز ریٹائرڈ ڈی سی صاحب کی کار سمن آباد گئی تو پروفیسر فخر گھر پر موجود نہ تھے۔ دوسری مرتبہ جب بی بی کی امی گئیں تو پروفیسر صاحب کسی سیمینار پر تشریف لے جا چکے تھے۔ ملاقات پھر نہ ہوئی۔ تیسری بار جب بی بی اور اباجی ٹیوشن کاٹ کرنے گئے تو پروفیسر صاحب مونڈھے پر بیٹھے ہوئے مطالعے میں مصروف تھے۔ باہر کے نلکے کے ساتھ نیلے رنگ کی پلاسٹک کی ٹیوب لگی ہوئی تھی۔ ٹیوب کا پانی سامنے کے تنگ احاطے میں اکٹھا ہو رہا تھا لیکن پروفیسر صاحب اس سے غافل مٹتی شفق میں حروف ٹٹول ٹٹول کر پڑھ رہے تھے۔

پہلے اباجی نے ہارن بجایا پھر خانساماں خانساماں کہہ کر آوازیں دیں۔ نہ تو اندر سے کوئی باورچی قسم کا آدمی نکلا اور نہ ہی پروفیسر صاحب نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بالآخر اباجی نے خفت کے باوجود دروازہ کھولا اور بی بی کو ساتھ لے کر برآمدے کی طرف چلے۔ ٹیوب غالباً دیر سے لگی ہوئی تھی اور مٹی کیچڑ میں بدل چکی تھی۔ بڑی احتیاط سے قدم دھرتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچے اور پھر کھنکار کر پروفیسر صاحب کو متوجہ کیا۔

پونہ گھنٹہ بیٹھے رہنے کے باوجود نہ تو اندر سے کوکا کولا آیا نہ چائے کے برتنوں کا ہی شور سنائی دیا۔ اس بے اعتنائی کے باوجود دونوں باپ بیٹی سہمے سے بیٹھے تھے۔ شام گہری ہو چلی تھی اور سمن آباد کے گھروں کے آگے چھڑکاؤ کرنے میں مشغول تھے۔ قطار صورت گھروں سے ہر سائز اور ہر عمر کا بچہ نکل کر اس چھڑکاؤ کو بطور ہولی استعمال کر رہا تھا۔ عورتیں نائیلون جالی کے دوپٹے اوڑھے آ جا رہی تھیں۔ ایک ایسے طبقے کی زندگی جاری تھی جو نہ امیر تھا اور نہ ہی غریب ـــــ دونوں کے درمیان کہیں مرغِ بسمل کی طرح لٹک رہا تھا۔

جب بات پڑھنے پڑھانے تک جا پہنچی تو پروفیسر فخر بولے:

"جی ہاں میں انہیں پڑھا دوں گا۔ بخوشی۔"

اب پہلو بدل کر ریٹائرڈ ڈی سی صاحب نے کہا ــــ "معاف کیجیے پروفیسر صاحب! لیکن بات پہلے ہی واضح ہونی چاہیے ــــ یعنی آپ ــــ میرا مطلب ہے آپ کی RENUMERATION کیا ہوگی؟"

ٹیوشن کی فیس کو خوبصورت سے انگریزی لفظ میں ڈھال کر گویا ڈی سی صاحب نے اس میں سے ذلت کی پھانس نکال دی۔

لیکن پروفیسر صاحب کا رنگ متغیر ہو گیا اور وہ مونڈھے کی پشت کو دیوار سے لگا کر بولے:

"میں ــــ مجھے ــــ دراصل مجھے گورنمنٹ پڑھانے کا عوضانہ دیتی ہے سر۔ اس کے علاوہ ــــ میں ٹیوشن نہیں کرتا ــــ تعلیم دیتا ہوں۔ جو چاہے جب چاہے مجھ سے پڑھ سکتا ہے۔"

"لیکن یہ تو آپ کی آفیشل ڈیوٹی نہیں ہے سر ــــ یہ تو ــــ!"

"دیکھیے جناب۔ میں اس لیے پڑھاتا ہوں کہ مجھے پڑھانے کا شوق ہے۔ اگر میں تحصیلدار ہوتا تو بھی پڑھاتا۔ اگر ضلع کا ڈی سی ہوتا تو بھی پڑھاتا۔ کچھ لوگ پیدائشی میری طرح ہوتے ہیں۔ ان کے ماتھے پر مہر ہوتی ہے پڑھانے کی ــــ ان کے ہاتھوں پر لکیر ہوتی ہے پڑھانے کی۔"

بی بی کے حلق میں نمکین آنسو آ گئے۔

دو غیرتوں کا مقابلہ تھا۔ ایک طرف ڈی سی صاحب کی وہ غیرت تھی جسے ہر ضلع کے افسروں نے کلف لگائی تھی۔ دوسری جانب ایک IDEALIST آدمی کی غیرت تھی جو گھونگے کی طرح اپنا سارا گھر اپنے ہی جسم پر لاد کر چلا کرتا ہے اور ذرا سی آہٹ پا کر اس گھونگے میں گوشہ نشین ہو جاتا ہے۔

پروفیسر صاحب بڑی بھلی سی باتیں کیے جا رہے تھے اور اس کے اباجی مونڈھے

میں یوں بیٹھے تھے جیسے بھاگ جانے کی تدبیریں سوچ رہے ہوں۔

"فائن آرٹس کا دولت کی ذخیرہ اندوزی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں سمجھتا ہوں میرا پروفیشن فائن آرٹس کا ایک شعبہ ہے۔ انسان میں کلچر کا شعور پیدا کرنے کی سعی ـــ انسان میں تحصیلِ علم کی خواہش کا بیدار کرنا ـــ عام سطح سے اٹھ کر سوچنا اور سوچتے رہنا ـــ ایک صحیح استاد ان نعمتوں کو بیدار کرتا ہے۔ ایک تصویر، ایک گیت، ایک خوبصورت بُت بھی یہی کچھ کر پاتے ہیں۔ ساز بجانے والے کو اگر آپ لاکھ روپیہ دیں اور اس پر پابندی لگائیں کہ وہ ساز کو ہاتھ نہ لگائے گا تو غالباً وہ ـــ اگر وہ GENUINE ہے تو آپ کی پیش کش ٹھکرا دے گا۔ میں ٹیچر ہوں۔ GENUINE ٹیچر ـــ میں FAKE نہیں ہوں ـــ زبیری صاحب ـــ!"

ڈی سی صاحب اپنی بیٹی کے سامنے ہار ماننے والے نہ تھے:

"اور جو پیٹ میں کچھ نہ ہو تو غالباً ساز ندہ مان جائے گا۔"

"پھر وہ ساز نواز FAKE ہوگا۔ PASSION کا اس کی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہوگا بلکہ غالباً وہ اپنے آرٹ کو ایک تمغہ، ایک پاسپورٹ، ایک اشتہار کی طرح استعمال کرتا ہوگا۔"

"اچھا جی آپ پیسے نہ لیں لیکن بی بی کو پڑھا تو دیا کریں۔"

"جی ہاں۔ بخوشی پڑھا دوں گا۔"

"تو کب آیا کریں گے آپ؟ ـــ میں کار بھجوا دیا کروں گا۔"

پروفیسر فخر کی آنکھیں تنگ ہو گئیں اور وہ ہچکچا کر بولے ـــ "میں تو کہیں نہیں جاتا شام کے وقت ـــ"

"تو میرا ـــــ تو میرا مطلب ہے کہ آپ اسے پڑھائیں گے کیسے؟"

"یہ چار سے پانچ کے درمیان کسی وقت آجایا کریں۔ میں پڑھا دیا کروں گا۔"

بی بی کے پیروں تلے سے یوں زمین نکلی کہ اس وقت تک واپس نہ لوٹی جب تک وہ اپنے پلنگ پر لیٹ کر کئی گھنٹے تک آنسوؤں سے اشنان نہ کرتی رہی۔

عورت کے لیے عموماً مرد کی کشش کے تین پہلو ہوتے ہیں:

بے نیازی

ذہانت اور

فصاحت

یہ تینوں اوصاف پروفیسروں میں بقدرِ ضرورت ملتے ہیں۔ اسی لیے ایسے کالجوں میں جہاں مخلوط تعلیم ہو لڑکیاں عموماً اپنے پروفیسروں کی محبت میں مبتلا ہو جاتی ہیں ـــ اس محبت کا چاہے کچھ نتیجہ نہ نکلے لیکن ہیرو ورشپ کی طرح اس کا اثر ان کے ذہنوں میں ابدی ہوتا ہے جس طرح ملکیت ظاہر کرنے کے لیے پرانے زمانے میں گھوڑوں کو داغ دیا جاتا تھا اسی طرح اس رات بی بی کے دل پر مہرِ فخر لگ گئی۔

ابا جی ہر آنے جانے والے سے پروفیسر فخر کے احمق پن کی داستان یوں سنانے بیٹھ جاتے جیسے یہ بھی کوئی ویت نام کا مسئلہ ہو۔ اُن کے ملنے والے پروفیسر فخر کی باتوں پہ خوب ہنستے۔ بی بی کو شبہ ہو چلا تھا کہ انھوں نے بیٹی کو ٹیوشن کی اجازت نہ دی تھی پھر بھی اندر ہی اندر ابا جی فخر کی شخصیت سے مرعوب ہو چکے ہیں۔

ایک دن جب بی بی اپنی ایک سہیلی سے ملنے سمن آباد گئی اور سامنے والی لائن میں اسے پروفیسر فخر کا مکان دکھائی دیا تو اچانک اس کے دل میں ایک زبردست خواہش اٹھی۔ وہ خوب جانتی تھی کہ اس وقت پروفیسر صاحب کالج جا چکے ہوں گے۔ پھر بھی وہ گھر کے اندر چلی گئی۔ سارے کمرے کھلے پڑے تھے۔ لمبے کمرے میں ایک چارپائی بچھی تھی جس کا ایک

پایہ غائب تھا اور اس کی جگہ اینٹوں کی تھئی لگی ہوئی تھی۔ تینوں کمروں میں کتابیں ہی کتابیں تھیں۔ ہر سائز، ہر پیپر اور ہر طرح کی پرنٹنگ والی کتابیں۔ ان کتابوں کو درستگی کے ساتھ آراستہ کرنے کی خواہش بڑی شدت کے ساتھ بی بی کے دل میں اٹھی۔

جستی ٹرنک پر پڑے ہوئے کپڑے، زرد روچھکلیاں جو بڑی آزادی سے چھت پر سے جھانک رہی تھیں اور کونوں میں لگے ہوئے جالے۔ ان چیزوں کا بی بی پر بہت گہرا اثر ہوا۔

باورچی خانے سے کچھ جلنے کی خوشبو آ رہی تھی لیکن پکانے والا دیگچی سٹوو پر رکھ کر کہیں گیا ہوا تھا۔ بی بی نے تھوڑا سا پانی دیگچی میں ڈالا اور سہیلی سے ملے بغیر گھر آ گئی۔

جس روز بی بی نے پروفیسر فخر سے شادی کرنے کا فیصلہ کیا اسی روز جمالی ملک کا رشتہ بھی آ گیا۔

جمالی ملک لاہور کے ایک نامی گرامی ہوٹل میں مینیجر تھے۔ بڑی پریس کی ہوئی شخصیت تھی اپنی پتلون کی کریز کی طرح۔ اپنے چمکدار بوٹوں کی طرح جگمگاتی ہوئی شخصیت ـــ وہ کسی ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار نظر آتے تھے۔ صاف ستھرے دانتوں کی چمک ہمیشہ چہرے پر رہتی تھی ـــ

جمالی ملک اپنے ہوٹل کی طرح تنظیم، صفائی اور سروس کا سمبل تھے۔

ایئر کنڈیشنڈ لابی میں پھرتے ہوئے، مدھم بتیوں والی بار میں سرپرائز وزٹ کرتے ہوئے لفٹ کے بٹن دباتے ہوئے، ڈائننگ ہال میں وی آئی پیز کے ساتھ پُر تکلف گفتگو کرتے ہوئے، ان کا وجود کٹ گلاس کے فانوس کی طرح خوبصورت اور چمکدار تھا۔

جس روز اس بڑے ہوٹل کے بڑے مینیجر نے بی بی کے خاندان کو کھانے کی دعوت دی۔ اسی روز ڈرائی کلینز سے واپسی پر بی بی کی مڈبھیڑ پروفیسر فخر کے ساتھ ہو گئی۔ وہ فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں والی دکانوں کے سامنے کھڑے تھے اور ایک پرانا سا مسودہ دیکھ رہے تھے۔

ان سے پانچ چھ قدم دور "ہر مال ملے گا آٹھ آنے" والا چیخ چیخ کر سب کو بلا رہا تھا ذرا ساہٹ کر وہ دکان تھی جس میں سرخ خونچوں والے، ہریل طوطے، سرخ افریقہ کی چڑیاں اور خوبصورت لقے کبوتر غٹرغوں غٹرغوں کر رہے تھے۔ پروفیسر صاحب پر سارے بازار کا کوئی اثر نہ ہو رہا تھا اور وہ بڑے انہماک سے پڑھنے میں مشغول تھے۔ کار پارک کرنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ بالآخر محکمۂ تعلیم کے دفتر میں جا کر پارک کروائی اور خود پیدل چلتی ہوئی پروفیسر فخر تک جا پہنچی۔

پرانی کتابیں بیچنے والے دور تک پھیلے تھے۔ کرم خوردہ کتابوں کے ڈھیر تھے۔ ایسی کتابیں اور رسالے بھی تھے جنہیں امریکن وطن لوٹنے سے پہلے میروں کے حساب سے بیچ گئے تھے اور جن کے صفحے بھی ابھی کھلے نہ تھے!

"سلام علیکم سر ــــ!"

چونک کر سر نے پیچھے دیکھا تو بی بی شرمندہ ہو گئی ــــ اللہ! اس پروفیسر کی آنکھ میں کبھی تو پہچان کی کرن جاگے گی؟ ہر بار نئے سرے سے اپنا تعارف تو نہ کروانا پڑے گا۔

"آپ اتنی دھوپ میں کھڑے ہیں سر ــــ"

پروفیسر نے جیب سے ایک بوسیدہ اور گندہ رومال نکال کر ماتھا صاف کیا اور آہستہ سے بولے۔ "ان کتابوں کے پاس آ کر گرمی کا احساس باقی نہیں رہتا۔"

بی بی کو عجیب شرمندگی سی محسوس ہوئی کیونکہ جب کبھی وہ پڑھنے بیٹھتی تو ہمیشہ گردن پر پسینے کی نمی سی آ جاتی اور اسے پڑھنے سے الجھن ہونے لگتی۔

"آپ کو کہیں جانا ہو تو ــــ جی میں چھوڑ آؤں آپ کو؟"

"نہیں۔ میرا سائیکل ہے ساتھ ــــ شکریہ!"

بات کچھ بھی نہ تھی۔ فٹ پاتھ پر پرانی کتابوں کی دکان کے سامنے ایک بے نیاز چھ فٹے پروفیسر کے ساتھ جس کے کالر پر پیل کا نشان تھا، ایک سرسری سی ملاقات تھی چند ثانیے بھر کی

لیکن اس ملاقات کا بی بی پر تو عجیب اثر ہوا۔ سارا وجود تحلیل ہو کر ہوا میں مل گیا۔ کندھوں پر سر نہ رہا ـــــ اور پاؤں میں چلنے کی سکت نہ رہی۔ حالانکہ پروفیسر فخر نے اس سے ایک بات بھی ایسی نہ کی جو بظاہر توجہ طلب ہوتی۔ پر بی بی کے تو ماتھے پر جیسے انھوں نے اپنے ہاتھ سے چندن کا ٹیکہ لگا دیا۔ کھوئی کھوئی سی گھر آئی اور غائب سی بڑے ہوٹل پہنچ گئی۔

جب وہ شموز کی ساڑھی پہنے آئینہ خانے سے لابی میں پہنچی تو دراصل وہ آکسیجن کی طرح ایک ایسی چیز بن چکی تھی جسے صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جمالی ملک صاحب شارک سکن کے سوٹ میں ملبوس، کالر میں کارنیشن کا پھول لگائے گھٹنوں پر کلف شدہ سرویٹ رکھے اتنے ٹھوس نظر آ رہے تھے کہ سامنے میز پر کہنیاں ٹکائے جھینگے کا پلاؤ اور چوپ سوئی کھانے والی لڑکی پر انھیں شبہ تک نہ ہو سکا اور وہ جان ہی نہ سکے کہ مسلسل باتیں کرنے والی لڑکی دراصل ہوٹل میں موجود ہی نہیں ہے۔

اگر بی بی کی شادی جمالی ملک سے ہو جاتی تو کہانی آئسنگ لگے کیک کی طرح دلآویز ہوتی۔ لفٹ کی طرح اوپر کی منزلوں کو چڑھنے والی، سوئمنگ پول کے اس تختے کی طرح جس پر چڑھ کر ہر تیرنے والا سمرسولٹ کرنے سے پہلے کئی فٹ اوپر چلا جایا کرتا ہے۔

لیکن ـــــ

شادی تو بی بی کی پروفیسر فخر سے ہو گئی۔

ڈی سی صاحب کی بیٹی کا بیاہ اس کی پسند کا ہوا اور اس شادی کی دعوت اس ہوٹل میں دی گئی جس کے مینیجر جمالی صاحب تھے۔ دلہن کے گھر والوں نے چار ڈی لکس قسم کے کمرے دو دن پہلے سے بک کر رکھے تھے اور بڑے ہال میں جہاں رات کا آرکسٹرا بجا کرتا ہے، وہیں دولہا دلہن کے اعزاز میں بہت بڑی دعوت رہی۔ نکاح بھی ہوٹل ہی میں ہوا اور رخصتی بھی ہوٹل ہی سے ہوئی۔ ساری شادی سے ہنگامہ مفقود تھا۔ ایک ٹھنڈ کا، ایک خاموشی کا احساس مہمانوں پر طاری تھا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے ہال میں یخ بستہ کولڈ ڈرنکز پیتے ہوئے سرد مہر سے

مہمانوں سے مل کر بی بی اپنے میاں کے ساتھ سمن آباد چلی گئی۔

لیکن اس رخصتی سے پہلے ایک اور بھی چھوٹا سا واقعہ ہوا۔

نکاح سے پہلے جب دلہن تیار کی جا رہی تھی اور اسے زیور پہنایا جا رہا تھا اس وقت بجلی اچانک فیوز ہو گئی۔ پہلے بتیاں گئیں۔ پھر ایئر کنڈیشنر کی آواز بند ہو گئی۔ چند ثانیے تو کانوں کو سکون سا محسوس ہوا لیکن پھر لڑکیوں کا گروہ کچھ تو گرمی کے مارے اور کچھ موم بتیوں کی تلاش میں باہر چلا گیا۔

اندھیرے کمرے میں ایک آراستہ دلہن رہ گئی۔ ارد گرد خوشبو کا احساس باقی رہا اور باقی سب کچھ غائب ہو گیا۔

بتیاں پورے آدھ گھنٹے بعد آئیں۔

اب خدا جانے یہ جمالی ملک کی سکیم تھی یا واپڈا والوں کی سازش تھی۔ بجلی کے چلے جانے کے کوئی دس منٹ بعد بی بی کے دروازے پر دستک ہوئی۔ ڈری ہوئی آواز میں بی بی نے جواب دیا:

"کم اِن ——"

ہاتھ میں شمعدان لیے جمالی ملک داخل ہوا۔

اس نے آدھی رات جیسا گہرا نیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ کالر میں سرخ کارنیشن کا پھول تھا اور اس کے آتے ہی تمباکو ملی کوئی تیز سی خوشبو کمرے میں پھیل گئی۔

بی بی کا دل زور زور سے بجنے لگا۔

"میں یہ بتانے آیا تھا کہ ہمارا جنریٹر خراب ہو گیا ہے تھوڑی دیر میں بجلی آ جائے گی —— کسی چیز کی ضرورت تو نہیں آپ کو؟"

وہ خاموش رہی۔

"میں یہ کینڈل سٹینڈ آپ کے پاس رکھ دوں؟"

اثبات میں بی بی نے سر ہلا دیا۔

جمالی ملک نے شمعدان ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا۔

جب پانچ موم بتیوں کا عکس بی بی کے چہرے پر پڑا اور کنکھیوں سے اس نے آئینے کی طرف دیکھا تو لمحہ بھر کو تو اپنی صورت دیکھ کر وہ خود حیران سی رہ گئی۔

"آپ کی سہیلیاں کدھر گئیں؟"

"وہ نیچے چلی گئی ہیں شاید ——"

"اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو —— تو میں یہاں بیٹھ جاؤں چند منٹ"

بی بی نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ اپالو کی طرح وجیہہ تھا۔ جب اس نے ایک گھٹنے پر دوسرا گھٹنا رکھ کر سر کو صوفے کی پشت سے لگایا تو بی بی کو عجیب قسم کی کشش محسوس ہوئی۔ جمالی ملک کے ہاتھ میں سارے ہوٹل کی ماسٹر چابیاں تھیں اور اس کی بڑی سی انگوٹھی نیم روشنی میں چمک رہی تھی۔

اس خاموش خوبصورت آدمی کو بی بی نے اپنے نکاح سے آدھ گھنٹہ پہلے پہلی بار دیکھا اور اس کی ایک نظر نے اسے اپنے اندر اس طرح جذب کر لیا جیسے سیاہی چوس سیاہی کو جذب کرتا ہے۔

"میں آپ کو مبارکباد پیش کر سکتا ہوں؟ ——" اس نے مضطرب نظروں سے بی بی کو دیکھ کر پوچھا۔

وہ بالکل چپ رہی۔

"لڑکیاں —— خاص کر آپ جیسی لڑکیوں کو ایک بڑا زعم ہوتا ہے اور اسی ایک زعم کے ہاتھوں وہ ایک بہت بڑی غلطی کر بیٹھتی ہیں۔"

نقلی پلکوں والے بوجھل پپوٹے اٹھا کر بی بی نے پوچھا —— "کیسی غلطی؟"

"کچھ لڑکیاں محض رشی سادھوؤں کی تپسیا توڑنے کو خوشی کی معراج سمجھتی ہیں۔

وہ سمجھتی ہیں کہ کسی بے نیاز کی ڈھال میں سوراخ کر کے وہ سکون کی معراج کو پالیں گی۔ کسی کے تقوے کو برباد کرنا خوشی کے مترادف نہیں ہے۔ کسی کے زہد کو عجز و انکساری میں بدل دینا کچھ اپنی راحت کا باعث نہیں ـــ ہاں دوسروں کے لیے احساسِ شکست کا باعث ہو سکتی ہے یہ بات ـــ"

چابیاں ہاتھ میں گھوم پھر رہی تھیں۔ ذہانت اور فصاحت کا دریا رواں تھا۔

"یہ زعم ـــ عورتوں میں، لڑکیوں میں کب ختم ہوگا! ـــ میرا خیال تھا آپ ذہین ہیں لیکن آپ بھی وہی غلطی کر بیٹھی ہیں جو عام لڑکی کرتی ہے ـــ آپ بھی توبہ شکن بننا چاہتی ہیں ـــ"

"مجھے ـــ مجھے پروفیسر فخر سے محبت ہے"۔

"محبت ـــ؟ آپ پروفیسر فخر کو یہ بتانا چاہتی ہیں کہ اندر سے وہ بھی گوشت پوست کے بنے ہوئے ہیں۔ اپنے تمام آئیڈیلز کے باوجود وہ بھی کھانا کھاتے ہیں۔ سوتے ہیں ـــ اور محبت کرتے ہیں ـــ ان کا کورٹ آف آرمز اتنا سخت نہیں جس قدر وہ سمجھتے ہیں"۔

وہ چاہتی تھی کہ جمالی ملک سے کہے تم کون ہوتے ہو مجھے پروفیسر فخر کے متعلق کچھ بتانے والے! تمہیں کیا حق پہنچتا ہے کہ یہاں لیدر کے صوفے سے پشت لگا کر سارے ہوٹل کی ماسٹر چابیاں ہاتھ میں لیے اتنے بڑے آدمی پر تبصرہ کرو ـــ لیکن وہ بے بس سنے جا رہی تھی اور کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔

"میں پروفیسر صاحب سے واقف نہیں ہوں لیکن جو کچھ سنا ہے اس سے یہی اندازہ لگایا ہے کہ ـــ وہ اگر مجرد رہتے تو بہتر ہوتا ـــ عورت تو خواہ مخواہ توقعات وابستہ کر لینے والی شے ہے ـــ وہ بھلا اس صنف کو کیا سمجھ پائیں گے؟"

"جمالی صاحب! ـــــ" اس نے التجا کی۔

"آپ سی لڑکیاں اپنے رفیقِ حیات کو اس طرح چنتی ہیں جس طرح مینو میں سے کوئی اجنبی نام کی ڈش آرڈر کر دی جائے۔ محض تجربے کی خاطر ـــ محض تجسس کے لیے ـــ"

وہ پھر بھی چپ رہی۔

"اتنے سارے حسن کا پروفیسر صاحب کو کیا فائدہ ہوگا بھلا ـــ رمنی پلانٹ پانی کے بغیر سوکھ جاتا ہے۔ عورت کا حسن پرستش اور ستائش کے بغیر مرجھا جاتا ہے ـــ کسی ذہین مرد کو بھلا کسی خوبصورت عورت کی کب ضرورت ہوتی ہے؟ اس کے لیے تو کتابوں کا حسن بہت کافی ہے۔"

شمعدان اپنی پانچ موم بتیوں سمیت دم سادھے جل رہا تھا اور وہ کیوٹیکس لگے ہاتھوں کو بغور دیکھ رہی تھی۔

"مجھ سے بہتر قصیدہ گو آپ کو کبھی نہیں مل سکتا قمر ـــ مجھ سا گھر آپ کو نہیں مل سکتا کیونکہ میرا گھر اس ہوٹل میں ہے اور ہوٹل سروس سے بہتر کوئی سروس نہیں ہوتی اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میری باتوں پر آپ کو اسوقت یقین آئے گا جب آپ کے چہرے پر چھائیاں پڑ جائیں گی۔ ہاتھ کیکر کی چھال جیسے ہو جائیں گے اور پیٹ چھاگل میں بدل جائے گا ـــ میں تو چاہتا تھا ـــ میری تو تمنا تھی کہ جب ہم اس ہوٹل کی لابی میں اکٹھے پہنچتے۔ جب اس کی بار میں ہم دونوں کا گزر ہوتا۔ جب اس کی گیلریوں میں ہم چلتے نظر آتے تو امریکن ٹورسٹ سے لے کر پاکستانی پیٹی بورژوا تک سب، ہماری خوش نصیبی پر رشک کرتے لیکن آپ آئیڈیلسٹ بننے کی کوشش کرتی ہیں۔ یہ حسن کے لیے گڑھا ہے بربادی کا۔"

ساون کی رات جیسا گہرا نیلا سوٹ، کارنیشن کا سرخ پھول اور آفٹر شیو لوشن سے بسا ہوا چہرہ بالآخر دروازے کی طرف بڑھا اور بڑھتے ہوئے بولا:

"کسی سے آئیڈیلز مستعار لے کر زندگی بسر نہیں ہو سکتی محترمہ ـــ آدرش جب تک اپنے ذاتی نہ ہوں ہمیشہ منتشر ہو جاتے ہیں۔ پہاڑوں کا پودا ریگستانوں میں نہیں لگا کرتا۔"

اس میں تو اتنا حوصلہ بھی باقی نہ رہا تھا کہ آخری نظر جمالی ملک پر ہی ڈال لیتی۔

دروازے کے مدوّر ہینڈل پر ہاتھ ڈال کر جمالی ملک نے تھوڑا سا پٹ کھول دیا۔ گیلری سے لڑکیوں کے ہنسنے کی آواز آنے لگی:

"میں بھی کس قدر احمق ہوں۔ اس سے اپنا کیس HEAD کر رہا ہوں جو کبھی کا فیصلہ کر چکی ہے ـــ اچھا جی مبارک ہو آپ کو ـــ"

دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا۔

جاتے ہوئے وجیہہ مینجر کو ایک نظر بی بی نے دیکھا اور اپنے آپ پر لعنت بھیجتی ہوئی اس نے نظریں جھکا لیں۔

چند لمحوں بعد دروازہ پھر کھلا اور ادھ کھلے پٹ سے جمالی ملک نے چہرہ اندر کر کے دیکھا۔ اس کی بلکی براؤن آنکھوں میں نمی اور شراب کی ملی جلی چمک تھی جیسے گلابی شیشے پر آہوں کی بھاپ اکٹھی ہو گئی ہو۔

"مجھ سے بہتر آدمی تو آپ کو مل رہا ہے ـــ لیکن مجھ سے بہتر گھر نہ ملے گا آپ کو مغربی پاکستان میں۔"

اسی طرح سنتو جمعدارنی کے جانے پر بی بی نے سوچا تھا۔ ہم سے بہتر گھر کہاں ملے گا کلوہی کو۔ اسی طرح خورشید کے چلے جانے پر وہ دل کو سمجھاتی تھی کہ اس بدبخت کو اس سے اچھا گھر کہاں ملے گا اور ساتھ ساتھ بی بی یہ بھی جانتی تھی کہ اس سے بہتر گھر چاہے نہ ملے وہ لوٹ کر

آنے والیوں میں سے نہیں تھیں۔ اتنے برس گزرنے کے بعد آج ایک پُل تعمیر ہو گیا آپ آپ ماضی سے جوڑنے والا۔ وہ دل برداشتہ انارکلی چلی گئی ـــــ اس کا خیال تھا کہ دو چار گھنٹے کی غیر موجودگی سب کچھ ٹھیک کر دے گی۔ سنتو جمعدارنی اور خورشید تک کو آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہو جائے گا۔

لیکن ہوا یوں کہ جب وہ اپنے اکلوتے دس روپے کے نوٹ کو ہاتھ میں لیے بانو بازار میں کھڑی تھی اور سامنے ربڑ کی چپلوں والے سے بھاؤ کر رہی تھی اور نہ چپلوں والا پونے تین سے نیچے اترتا تھا اور نہ وہ ڈھائی روپے سے اوپر چڑھتی تھی، عین اس وقت ایک سیاہ کار اس کے پاس آ کر رکی۔

اپنے بوائی پھٹے پیروں کو نئی چپل میں پھنساتے ہوئے اس نے ایک نظر کار والے پر ڈالی۔

وہ اپالو کے بت کی طرح وجیہ تھا۔

کنپٹیوں کے قریب پہلے چند سفید بالوں نے اس کی وجاہت پر رعبِ حسن کی مہر بھی لگا دی تھی۔ وقت نے اس سینٹ کا کچھ نہ بگاڑا تھا۔ وہ اسی طرح محفوظ تھا جیسے ابھی ابھی کولڈ سٹوریج سے نکلا ہو۔

بی بی نے اپنے کیکر کے چھال جیسے ہاتھ دیکھے ـــــ
پیٹ پر نظر ڈالی جو چھاگل میں بدل چکا تھا ـــــ
اور ان نظروں کو جھکا لیا جن میں اب کتیرہ گوند کی بجھی بجھی سی چمک تھی ـــــ
جمالی ملک اس کے پاس سے گزرا لیکن اس کی نظروں میں پہچان کی گرمی نہ سلگی۔

واپسی پر وہ پروفیسر صاحب سے آنکھیں چرا کر بستر پر لیٹ گئی اور آنسوؤں کا رکا ہوا سیلاب اس کی آنکھوں سے بہ نکلا۔

پروفیسر صاحب نے بہت پوچھا لیکن وہ انہیں کیا بتاتی کہ درخت چاہے کتنا ہی اونچا

کیوں نہ چلا جائے اس کی جڑیں ہمیشہ زمین کو ہوس سے کریدتی رہتی ہیں۔ وہ انہیں کیا سمجھاتی کہ آئیڈیلز کچھ مانگے کا کپڑا نہیں جو پہن لیا جائے۔

وہ انہیں کیا کہتی کہ عورت کیسے توقعات وابستہ کرتی ہے ——

اور ——

یہ توقعات کا محل کیونکر ٹوٹتا ہے؟

وہ غریب پروفیسر صاحب کو کیا سمجھاتی!

ایسی باتیں تو غالباً اب جمالی ملک بھی بھول چکا تھا۔

———

پسپائی

ساتھ والے کمرے سے چیخ کر منّی نے پوچھا:

"آپا ـــــ! اِنڈ کے کیا معنی جی؟"

"اِنڈ کے؟"

"جی ہاں اِنڈ کے! کیا معنی ہوئے بھلا؟"

"تھوڑی؟"

"تھوڑی ـــــ یعنی تھوڑی چیز؟ ـــــ کیوں آپا یہی نا!ـــــ" منّی نے چیختی ہوئی آواز میں پھر پوچھا۔

"چلو یوں ہی سمجھ لو" ـــــ صوفیہ نے اکتا کر کہا۔

چند لمحے خاموشی رہی۔ اس نے نیلے لفافے پر نگاہیں گاڑ دیں اور ماتھے پر اَن گِنت تیوریاں ڈال کر پھر سوچ میں ڈوب گئی۔

"آپا ـــــ آپا اس کے کیا معنی ہیں، ہنوز چشمش نگراں است کہ ملکِ باد گراں است؟"

ساتھ والے کمرے سے پھر آواز آئی۔

صوفیہ کی نگاہوں سے جھلاہٹ ظاہر ہونے لگی اور ماتھے کی شکنیں گہری ہو گئیں۔

اس نے جھڑکنے کے انداز میں کہا:

"منی اگر تم کو گلستان پڑھنا ہے تو ابا کے پاس بیٹھو۔ مجھے فارسی نہیں آتی"۔

منی اس کے دروازے میں آ کھڑی ہوئی اور نیلے سوتی پردوں میں سے جھانکتی ہوئی بولی ــــ "بتا دو نا آپا جی ــــ پرسوں ٹسٹ ہے۔ ہائے اللہ بتا بھی دو"۔

"ابھی تک نگاہ نگرانی کرتی ہے گو ملک کسی اور کی ملکیت ہو چکا ہے ــــ سنا؟"۔ آپا نے جلدی جلدی لاتعلقی سے کہا۔

"ابھی تک اس کی نگاہ ــــ" منی رک گئی۔

"نگرانی کرتی ہے۔ گو ملک کسی اور کی ملکیت ہو چکا ہے" ــــ صوفیہ نے دہرایا۔

"جی ــــ شکریہ ــــ چشمش نگراں است کہ ــــ" رٹتی ہوئی منی رخصت ہو گئی لیکن صوفیہ کے ذہن میں یہ جملہ چکر لگانے لگا۔ رات کے اندھیرے میں شکستہ مقبرے کے موکھے سے کوئی کبوتر سوتے میں مرقد پر پھڑ پھڑانے لگا۔

اس نے گود میں پڑا ہوا نیلا لفافہ کھولا۔ اس کی ملفوف تحریر پڑھی۔ ایک لمحے کے لیے آئینے میں دیکھا اور پھر اپنے ٹرنک کے کپڑے نکالنے میں مشغول ہو گئی۔

صوفیہ کا قد اگر دو انچ لمبا ہوتا تو اس کی چال کا وقار بڑھ جاتا۔ اگر اس کی سانولی صورت ذرا نکھری ہوتی تو اس کی آنکھوں کے سیاہ بھونرے اور بالوں کا ریشمی اندھیرا بڑا دلفریب ہوتا۔ اگر اس کی ناک آگے سے اس قدر پھیلی ہوئی نہ ہوتی تو بھیگے بھیگے ہونٹ بڑے دلآویز نظر آتے ــــ اور پھر اگر اس کی گردن ذرا سی اور اونچی ہوتی تو اس کی ساری شخصیت کا مجموعی تاثر زیادہ جاذبِ نظر ہوتا۔ اس کے گلے میں ایک جیتی جاگتی مینا بیٹھی تھی لیکن کبھی کبھی نہ جانے کیوں اس مینا کی چہکار طوطے کی پکار بن کر رہ جاتی تھی لیکن تھا یوں کہ صوفیہ کی ہر ایک چیز میں بس ایک انچ کی کسر رہ گئی تھی۔

وہ بڑی پیاری سی لڑکی تھی لیکن خوبصورت ہونے کا ارمان اس کے جی ہی جی میں دم

توڑ گیا۔ صوفیہ کو کس کس چیز کا افسوس نہ تھا۔ وہ ناک کے لیے دعا کرے کہ رنگ نکھرنے کی تمنائیں آہیں بھرے۔ گردن لمبی ہو جانے کی آرزو میں مرے کہ درازیٔ قد کے لیے سربسجود رہے؟ ــــ یونہی شیشے پر نظر پڑ جانے سے اس کے لبوں سے ایک سرد آہ نکلتی اور ہوا میں اس طرح تحلیل ہو جاتی جیسے پانی میں برف کی کرچی!

"آپا ــــ آپا جی ــــ یہ فیکٹر کس فارمولے سے حل کروں؟ ــــ" نعیم نے اپنی کاپی اس کی ناک تلے کر کے پوچھا۔

صوفیہ نے اپنی بانہوں میں بھرے ہوئے کپڑے پلنگ پر ڈھیر کیے اور چڑ کر بولی ــــ "کسی فارمولے سے بھی نہیں۔"

"کسی فارمولے سے بھی نہیں آپا؟" ــــ نعیم نے حیران ہو کر پوچھا۔

"جی صاحب کوئی فارمولا نہیں لگے گا۔ اب جائیے ــــ"

"بتا دو آپا جی ــــ پلیز آپا۔ ماسٹر جی آتے ہی ہوں گے۔ سوال کیسے حل ہوگا؟ ــــ" نعیم نے منت کی۔

"حل نہیں ہوگا ــــ بس نہیں ہوگا۔ دفع ہو جاؤ۔ ایک تو سارے جہاں کی پڑھائی اسی گھر میں گھس آئی ہے۔" صوفیہ نے جل کر کہا۔

"کیا آپا؟ ــــ"

"میں کہتی ہوں اور بچے بھی تو ہوتے ہیں۔ ہنستے کھیلتے ہیں۔ مزے کرتے ہیں۔ یہاں ایسا چوبیس گھنٹوں کا مکتب کھلا ہے کہ صبح سے شام تک آموختے ہی رٹے جاتے ہیں۔"

"تم ناراض ہو آپا؟ ــــ" نعیم نے کچھ اس طرح پوچھا کہ صوفیہ مسکرا دی۔

"نہیں بھئی ــــ لاؤ کاپی ــــ"

صوفیہ نے ہاتھ بڑھا کر سوال حل کر دیا اور آہستہ سے بولی:

"دیکھو نعیم! فارمولوں سے کچھ نہیں بنتا۔ کتابوں سے کچھ نہیں سنورتا۔ زندگی میں

ایک چیز تجربہ بھی ہے۔ ایک چیز ڈھنگ بھی ہوتی ہے۔ جنہیں تجربے کی روشنی میں زندگی کرنے کا ڈھنگ آگیا وہ جیت گئے۔

"کیا کیا کیا؟ ——" نعیم نے منہ کھول کر پوچھا۔

لیکن آپا نے جو بات اپنے آپ سے کہنی تھی آگے نہ بڑھائی اور ہنس کر بولی:

"کچھ نہیں بھئی۔ جاؤ سوال نکالو ماسٹر صاحب آتے ہی ہوں گے۔"

صوفیہ نے دھلے ہوئے کپڑوں کا انبار بستر پر لگا دیا لیکن اتنے سارے کپڑوں کے باوجود اس کے ماتھے کی لکیریں آپس میں جڑی ہوئی تھیں اور لبوں کے دونوں کونے لٹکے ہوئے تھے۔

ماتھے پر گرے ہوئے بالوں کو ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے اس نے ایک ایک کپڑے کا بغور جائزہ لیا۔ نیلی قمیض اچھی تھی لیکن اس کے ساتھ کا دوپٹہ کل منی کالج اوڑھ کر لے گئی تھی تو اس کا کنارہ سائیکل کی چین نے چبا ڈالا —— گلابی سوٹ بہتر ثابت ہو سکتا تھا لیکن اب تو قمیصیں اس قدر لمبی ہو چکی تھیں کہ ٹخنوں کی خبر لاتی تھیں اور یہ گلابی قمیص دو سال پہلے کی سلوائی ہوئی تھی جب شلوار کی اپنی ایک منفرد حیثیت ہوا کرتی تھی —— اس نے سبز غرارہ اور قمیص نکال کر جائزہ لیا۔ سب کچھ ٹھیک تھا۔ قمیص اس کے جسم کے خطوط پر ٹھیک بیٹھتی تھی۔ غرارہ چلتے میں یوں آواز دیتا جیسے کوچوان چابک جھٹک رہا ہو۔ گوٹ اچھی کٹی تھی۔ لمبائی ٹھیک تھی۔ گھیرا خوب تھا لیکن ایسے خوبصورت غرارے قمیص کے ساتھ سوتی جالی کا دوپٹہ تو یوں لگتا تھا جیسے پھولوں سے لدا پھندا دولہا سائیکل پر جا رہا ہو —— اور باقی کپڑے تو سب کے سب صفر تھے۔ کم از کم صوفیہ کا یہی خیال تھا۔ اس نے اپنے جی میں سوچا، لال قمیص انتہا کی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔ سانولا رنگ اور لال قمیص گویا حبشی تربوز کھا رہا ہو —— اور سفید کپڑے بھی ناموزوں رہیں گے۔ کیونکہ ایسا نہ ہو کوئی سمجھے کوا چونچ میں چونچ نکالے بیٹھا ہے —— اور زرد رنگ تو وہ کسی قیمت پر بھی پہننے کی جرأت نہیں

کر سکتی تھی۔ لگے گا سرسوں میں بھینس پھر رہی ہے۔

اس نے ناپسندیدگی سے اپنے کپڑوں پر جی ہی جی میں تبصرہ کیا اور پھر قلم کاغذ اٹھا کر اپنی سہیلی کو رقعہ لکھنے لگی:

یک دم کمرے میں ننھی پپو داخل ہوئی اور اس کی بانہہ پہ قاعدہ رکھتے ہوئے بولی:

"اور آپی دی "ع" سے عینک ہوتی ہے ناں؟"

"جی.... ہاں عینک ہی ہوتی ہے۔" وہ جلدی سے پیڈ پر قلم گھسیٹتی رہی۔

"پر تیوں ہوتی ہے؟"

"ہوتی ہے پپو "ع" سے عینک اور "ق" سے قینچی! — یہ جانے کب سے ہوتی چلی آئی ہیں اور کب تک ہوتی چلی جائیں گی۔"

"پر تیوں تیوں تیوں دی؟"

"بس ایسے ہی ہوتا ہے پپو —"

صوفیہ نے زبان لفافے پر پھیرتے ہوئے کہا اور پھر پپو کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی — "دیکھ۔ یہ رقعہ لے اور نعیم کو ساتھ لے کر آپا افضل کے گھر جانا۔ سن رہی ہے نا۔ — آپا افضل کے گھر۔ وہاں سوڈا واٹر نہ پینے بیٹھ جانا۔ وہ تجھے کچھ کپڑے دیں گی...."

پپو نے یک دم ٹوک کر کہا۔ "کپڑے آپی دی۔ پر تیوں؟"

"بس دیں گی کپڑے۔ سنبھال کر سیدھی میرے پاس لانا — میں تجھے چیونگ گم دوں گی۔ سنا؟"

"تتنی تیونگ گم؟"

"ایک — !" صوفیہ بولی۔

"تین — !"

"نہیں دو —"

"دو تیوں ؟ تین! چھاڑ ـــــ"

"اور مجھے کتنی چیونگ گم دو گی آپا ؟ ـــ" نعیم نے ساتھ والے کمرے سے نارل ہوتے ہوئے پوچھا۔

"دو ـــ" صوفیہ بولی۔

"نہیں آپا، چار! ـــ" نعیم منمنایا۔

"اچھا تین ـــ"

"نہ آپا۔ پوری چار"

"جاؤ میں خط نہیں بھجواتی۔ منگتے کہیں کے!" صوفیہ نے چڑ کر جواب دیا۔

"اچھا مجھے چھ دے دینا۔ میں اکیلا ہی چلا جاتا ہوں ـــ" نعیم نے پپو سے خط چھینتے ہوئے کہا۔

"اوں ہوں! ـــ خط پھٹ جائے گا۔ تمہیں گھر کا تو پتہ نہیں بھلا جاؤ گے کیسے ؟" صوفیہ نے پوچھا۔

"پوچھ لوں گا جی۔ اس دن چوہدری باجی نزہت کے گھر اکیلا ہی تو گیا تھا آپا ؟" نعیم نے وثوق سے کہا۔

"تیوں تم داؤ دے ؟ تم مجھے تین دے دینا میں دینب کو لے تر جاتی ہوں" ـــــ چھوٹی پپو خط کلیجے سے لگاتے ہوئے بولی۔

"اگر جاتے ہو تو اکٹھے جاؤ ورنہ میں خود چلی جاؤں گی" صوفیہ نے روہانسی ہو کر کہا۔

اور جب پپو اور نعیم رخصت ہو گئے تو اس نے بغیر سنوارے سارے کپڑے ٹرنک میں ڈھیر کر دیے۔ لگتا تھا امریکی گونوں کی گانٹھ سے ابھی پتریاں کٹی ہیں۔

پلنگ پر آف وائٹ رنگ کی ساڑھی تازہ استری کر کے رکھی گئی۔ ساتھ ہی سلکی بلاؤز ہینگر پر ٹانگا گیا جیسے لاجونتی کا پودا ہو۔ شرمیلا سا۔ ہاتھ لگتے ہی چرمر ہو جانے والا ـــ